محمد مجیب

مذہبی ارتقاء کے نظریے

تاریخ سے ثابت ہے کہ مذہب کے بغیر اجتماعی زندگی ممکن نہیں، اور محققوں کو اب تک بہت تلاش کرنے کے باوجود وحشی نسلوں میں بھی کوئی ایسا قبیلہ نہیں ملا ہے جو لامذہب کہا جاسکے، مگر آج کل کی ترقی یافتہ یورپی قوموں میں سے بعض کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان کا کوئی اجتماعی مذہب نہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ مذہب کی ضرورت صرف نشوونما کی ابتدائی منزلوں میں ہوتی ہے، اس کے بعد مذہب ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی مذہب پر بحث کرتے ہیں تو ان کے مدنظر یورپ کی معاشرت اور ذہنیت ہوتی ہے، اسی کو وہ معیار مانتے ہیں اور علم کی خدمت یا معاشرتی ترقی کی خاطر مذہب کو چھوڑنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس مسئلے پر بحث کرنا ہر عاقبت اندیش آدمی کا فرض ہوگیا ہے، اگرچہ اس میں خطرے بہت ہیں، کیوں کہ مذہب کے بیشتر حامی اور مخالف ایک دوسرے کی بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور سب سے زیادہ ماران لوگوں پر پڑتی ہے جو جھگڑا چکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس بھڑ کے چھتے کو چھیڑا ہے، اور پہلے ہی سے کہے دیتا ہوں کہ میں کوئی محقق نہیں ہوں، مسلمان ہوں، مگر فقہ میں ذرا بھی ملکہ نہیں رکھتا، اپنے مذہب کو سچا سمجھتا ہوں، مگر ان لوگوں کی طرف سے منہ پھیرنا نہیں چاہتا جو میرے ہم خیال نہیں ہیں۔ ہر جماعت اور ہر زمانے میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جن میں مذہب کا جذبہ بہت کمزور ہوتا ہے یا بالکل ہوتا ہی نہیں، اور ظاہر ہے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ دوسرے مذہب پر جان کیوں دیتے ہیں۔ ایسے لوگ اور بھی زیادہ ہوتے ہیں جو عقائد کو فیشن کی طرح بدلتے رہتے ہیں، ان کے لیے مذہب ذہنی لباس ہوتا ہے اور اس لیے ان کی شخصیت اس سے بے بہرہ رہتی ہے۔ ہندوستان میں دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں اور اتفاق سے آج کل پیش پیش بھی ہیں۔ ان کو قائل کرنا دشوار ہے، اور میرے خیال میں ضروری بھی نہیں، لیکن خاموش رہنے میں اس کا اندیشہ ہے کہ بہت سے ایسے لوگ

بگڑ جائیں گے جن کے دلوں میں مذہب کی طلب ہے، مگر اپنے ماحول میں انہیں وہ رنگ نظر نہیں آتا جو سچے اور موثر مذہب میں ہونا چاہیے، یا ان کے دل میں کوئی شک ہوتا ہے جسے وہ اپنے خلوص کی وجہ سے چھپا نہیں سکتے، اور اسے ظاہر کرتے ہیں تو بے دین کہلاتے ہیں۔ جو لوگ اسلام سے عقیدت رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی کو دین کے نور سے روشن کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے اس زمانے میں خاموش رہنا یا مخالفوں کو خاموش کرنے کے واسطے ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کرنا بدترین مسلک ہے جو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ہم اپنے دین کا جتنا چرچا کریں گے، اتنا ہی وہ ہماری زندگی میں نمایاں ہوگا، اور جس قدر ہم دوسروں کے دل و دماغ پر اثر ڈالنے کی کوشش کریں گے، اتنا ہی ہمارا اپنا عقیدہ مضبوط ہوگا۔

بحث کرتے وقت مذہب کے حامی عام طور سے شک کو گمراہی اور گمراہی کو ایک جرم فرض کر لیتے ہیں اور شک کو دور کرنے سے زیادہ انہیں جرم کی سزا دینے کی فکر پڑ جاتی ہے۔ حالاں کہ شک کا جتنا لحاظ کیا جائے، اتنی ہی آسانی سے رفع ہو سکتا ہے۔ اگر شک کرنے والا اس جذبے سے محروم ہے جو دین کا سنگ بنیاد ہے تو یہ امر واضح ہو جائے گا اور بحث کی ضرورت نہ رہے گی، لیکن اگر شک کرنے والا واقعی حقیقت کی تلاش میں ہے تو یہ دیکھ کر کہ اس کے خیالات کی قدر کی جاتی ہے، ہر مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرے گا اور اس کے دل میں وہ غبار نہ ہوگا جو سختی اور عداوت سے پیدا ہوتا ہے۔

اس وقت مذہب کے مخالفوں کی تعداد، اور زیادہ ان کی گمراہی، اور بھی نقصان دہ اس سبب سے معلوم ہوتی ہے کہ ہماری جماعت میں بہت سے معاشرتی اختلافات نمودار ہوئے ہیں، اور چوں کہ معاشرتی آئین مذہبی عقائد سے اخذ کیے جاتے ہیں، معاشرتی اور دینی اختلافات میں تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے، لیکن آج کل ان میں فرق کرنا ہماری بقا کے لیے لازمی ہے۔ زندگی میں مذہبی عقائد کی وہی حیثیت ہے جو نظامِ شمسی میں سورج کی۔ وہ ایک مرکز ہے جس کے گرد سب کچھ چکر لگاتا ہے، اور اسی چکر لگانے سے ہر جزو کا ارتقاء ہوتا ہے۔ جب تک سورج اپنی جگہ پر قائم ہے، یہ نظام قائم رہے گا، اور کوئی شہابِ ثاقب جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو نظام میں فرق نہیں پڑے گا۔ ہماری زندگی میں بہت سے معاشرتی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو ہماری جماعت میں تفرقہ ڈال رہے ہیں، اگر ہم نے ان کی نوعیت صحیح طور پر نہ سمجھی اور ان کی اہمیت کا غلط اندازہ لگایا تو ممکن ہے وہ بہت زیادہ فساد برپا کریں اور سطحی معاشرتی

اختلافات سے ہمارے اجتماعی مذہب کو صدمہ پہنچے۔

اس وقت مغربی اور مشرقی تہذیب کی قربت اور ان کے تصادم نے معاشرتی مسائل کو بہت ابھار دیا ہے۔ یورپی اصولِ تحقیق اور بحث کے مطابق ہمیں سب سے پہلے اپنی معاشرت کا گہرا تاریخی مطالعہ کرنا چاہیے، جو اس وقت نہ ہمارے قدامت پسند رہنما کرتے ہیں، نہ انقلاب پسند نوجوان۔ غلامی ہمارے ذہن میں اس طرح سما گئی ہے کہ ہم اپنی تاریخ کی مطلق قدر نہیں کرتے، ہم میں سے بیشتر خود بخود اپنے آقاؤں کی تقلید کرتے ہیں، اور جو آقاؤں کی تقلید کو بُرا سمجھتے ہیں، وہ کوئی ایسی ذہنی اور معاشرتی وضع پیش نہیں کر سکتے جو ہماری اپنی ہو اور موجودہ ماحول میں کھپ سکے، لیکن معاشرتی مسائل پر بحث کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ میں صرف اپنے موضوع کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ اسے نظر انداز کرنے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہمارے تعلیم یافتہ لوگ اگر اپنی معاشرتی تاریخ سے جیسا کہ چاہیے واقف ہوتے، تو انہیں اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہ ہوتی کہ یورپ میں جن حالات کے ماتحت مذہبی عقائد اور معاشرتی قوانین پر بحث شروع ہوئی، ان سے مسلمانوں کو حیثیت مجموعی کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ ہمارے نظامِ معاشرت میں نہ کبھی کلیسا کی حکومت تھی، نہ بدعتوں کو دور کرنے کے لیے کوئی مستقل محکمہ، جیسے کہ یورپ میں عدالتِ احتساب۔ ہمارے مذہبی رہنما کبھی لگان وصول کرنے کے قانوناً مستحق نہیں مانے گئے، اور دین داری کا جو تصور ہمارے یہاں بیشتر رائج رہا، اس میں کبھی نفس کشی اور رہبانیت پر اتنا زور نہیں دیا گیا کہ انسانی فطرت اسے گوارا نہ کر سکے۔ مذہب کا نام سن کر ظلم اور جبر، تنگ نظری اور خود غرضی کی جو داستانیں یورپ کے ہر روشن خیال باشندے کو یاد آجاتی ہیں وہ ہمارے یہاں بہت کم سننے میں آئی ہیں، اور تصوف کی بدولت ہمارے عقیدوں اور خیالات میں جو لوچ پیدا ہو گیا ہے وہ یورپ کے کسی مذہب کو نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے ہمیں مذہب پر بالکل ہی دوسرے انداز اور نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے، لیکن اس صریح حقیقت پر اصرار کرنا بھی فضول ہے، جب کوئی ساٹھ برس سے ہماری تعلیم گاہوں میں یہ سبق پڑھایا جا رہا ہے کہ مذہب تمام ذہنی اور معاشرتی امراض کی جڑ ہے، اور ہم نے اس سبق کو ایسا یاد کیا ہے کہ اب وہ بھلایا نہیں جاتا۔ اب مصلحت یہی ہے کہ مذہب پر اسی طرح بحث کی جائے جیسے کہ یورپ میں کی گئی ہے اور جیسے ہمارے روشن خیال انقلاب

پسند لوگ کرتے ہیں۔ اس میں دراصل ہمارا کوئی نقصان نہیں، بلکہ کچھ فائدہ ہی ہے۔

یورپ میں جب کلیسائی مذہب کا زوال ہو گیا، اور اس کے مخالفوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تو مذہب کو علم نے رفتہ رفتہ اپنے سائے میں لے لیا، آوگست پہلا شخص تھا جس نے اصولاً علم کو مذہب کا اتالیق بنایا۔ مذہب لاوارث اور بے مایہ تھا، کونت کے دل میں بذات خود اس کی کوئی قدر نہیں تھی، لیکن اس کو یقین تھا کہ علم کی نگرانی میں رکھ کر مذہب سے بہت مفید کام لیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اور تمام مذہبوں کو منسوخ کر کے ''مذہبِ انسانیت'' کے نام سے ایک نیا مذہب قائم کیا اور اس کے لیے مناسب رسمیں بھی تجویز کیں۔ انسانیت سے اُس کی مراد نوعِ انسانی حیثیتِ مجموعی تھی، اور وہ چاہتا تھا کہ لوگ اس ''عظیم ہستی'' کو اس طرح عبادت کا مستحق سمجھیں جیسے گزشتہ زمانے کے ''جاہل'' اور ''گمراہ'' لوگ خدا کی پرستش کرتے تھے۔ ابتدا میں ہر بستی اور گھرانے کا اپنا دیوتا ہوتا تھا، پھر انسانی تخیل نے ایک خدا ایجاد کیا جس کا اقتدار دیوتاؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا، مگر خدا کو بھی لوگوں نے اپنی قومی یا نسلی اغراض میں ایسا الجھا دیا کہ اس سے انصاف اور رہنمائی کی توقع رکھنا فضول سا ہو گیا ہے۔ وہ عیسائیوں کی مسلمانوں کے خلاف مدد کرتا تھا، مسلمانوں کی عیسائیوں کے خلاف۔ اور ہم یہ مان لیں کہ دراصل عیسائی اور مسلمان دونوں کو مغالطہ تھا، تب بھی ایسا خدا کس کام آسکتا ہے جو مختلف قوموں اور نسلوں کو اتنی صدیوں تک لڑاتا رہا ہے۔ مہذب اور علم پرست قوموں کے مہذب علم پرست آدمی ایسے خدا کو تسلیم بھی نہیں کر سکتے جس کا وجود علمی تحقیق سے ثابت نہ کیا جاسکتا ہو، لیکن ایک خدا کی ضرورت بہر حال ہے، اور اگر ہم نوعِ انسانی کی ''عظیم ہستی'' کو اپنا خدا تصور کریں تو یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے گی، اور تہذیب اور علم پرستی پر حرف بھی نہ آئے گا۔

کونت نے خواہ مخواہ ایک نیا مذہب ایجاد نہیں کیا۔ دنیا کی معاشرتی تاریخ کا مطالعہ کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ انسان کی ذہنی نشوونما کے تین مدارج ہوتے ہیں۔ ابتداء میں ''دینیات'' اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہوتی ہے، اور اس کی معاشرت کے قوانین، اس کے دینی عقائد سے اخذ کیے جاتے ہیں، پھر ''مافوق الفطری'' دور آتا ہے، جب فلسفیانہ غور و فکر کا چرچا ہوتا ہے، اور انسان نظری اصولوں کو اپنی معاشرت میں مجسم کرنے کی کوشش میں

لگا رہتا ہے۔ آخر میں دینیات کی طرح نظری اصولوں کا طلسم بھی ٹوٹ جاتا ہے، ''علم'' کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، اور مغالطے اور جہالت کی تاریکی دور ہو جاتی ہے۔ کونت کو یقین تھا کہ یورپ میں علوم صحیحہ کا دور شروع ہو گیا ہے، یورپ والوں کو مذہب اور نظری اصول بچپن کی عادتوں کی طرح بھلا دینے چاہییں، اور اپنی پوری ذہنی قوت علوم صحیحہ کو ترقی دینے میں صرف کرنا چاہیے۔

افسوس ہے کہ ''ثبوتیت'' کے بانی کا پہلا ہی قدم استخراجی طریقہ تحقیق کے دلدل میں پڑا! ذہنی ارتقاء کے مدارج قائم کرنا جب ارتقاء کے پورے سلسلے کا یقینی اور قطعی علم نہ ہو، اور اس سے ایسے نتیجے نکالنا جو دلیل اور ثبوت ہی کے محتاج نہ ہوں، بلکہ عقیدے کی حیثیت رکھتے ہوں، علوم صحیحہ کے اصول سے بالکل غلط ہے، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ کونت اپنی تاریخی معلومات کی بنا پر عام انسانی ارتقاء کی نسبت کوئی رائے دینے کا مستحق نہیں تھا۔ اس کی نظر میں صرف یورپی قوموں کی تاریخ تھی، لیکن قانون اس نے ساری دنیا کے لیے بنایا، اور اس لیے اس کے دعوے اس کے اپنے منطقی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ممکن ہے کسی زمانے میں دینیات، نظری غور و فکر یا علوم صحیحہ میں سے کوئی ایک باقی دونوں پر حاوی ہو جائے، مگر انسانی تاریخ میں ایسا کوئی دور نہیں ہوا ہے جو خالص دینیات یا خالص علوم صحیحہ کا دور کہا جا سکے۔ دراصل انسان کا ذہن اور تخیل ہر زمانے میں ان تینوں سرچشموں سے قوت اور ہدایت حاصل کرتا ہے اور زندگی کا باغ اسی وقت سرسبز ہوتا ہے جب یہ تینوں اس کو سیراب کرتے ہیں۔ ان تینوں میں سے کوئی ایک بذاتِ خود مکمل نہیں ہے اور انسان کی تمام ذہنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔

کونت کا علمی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے افادہ اور صحیح ذہنی تربیت کے خیال سے علوم صحیحہ کے مراتب قائم کیے۔ سب سے کم درجہ اس نے ریاضیات کو دیا، اور سب سے اعلیٰ مرتبہ اجتماعیات کو۔ یہ ترتیب کونت کی ایک جدت تھی جسے اس کے خاص معتقدوں کے سوا کسی نے تسلیم نہیں کیا، اور اب یہ بالکل غلط سمجھی جاتی ہے، لیکن اجتماعیات کی اہمیت کا سب کو فوراً احساس ہوا، جماعتوں کی معاشرت اور عقائد کا بڑی سرگرمی اور جان فشانی سے مطالعہ شروع کر دیا گیا، وحشی سے وحشی قبیلوں اور مہذب سے مہذب نسلوں کی اجتماعی زندگی کا علمی خورد بین اور باریک بینی کے دوسرے آلات سے معائنہ کیا گیا، اور ان کے عقائد، رسم و رواج

اور تعصّبات وغیرہ تفصیل کے ساتھ معلوم کیے گئے۔ چوں کہ مذہب شروع سے آخر تک جماعتوں کی زندگی میں اپنا اثر دکھاتا رہا ہے، اس لیے اس کی بہترین شکل کا جو ''اہل کتاب'' کے عقائد میں ظاہر ہوتی ہے، وحشی نسلوں کی جان پرستی اور جانور پرستی سے اِس کا سلسلہ ملایا گیا اور دوسرے اجتماعی مظاہر کے ساتھ مذہب کی نشوونما کے مدارج قائم کر دیے گئے۔ افسوس ہے اس علمی تحقیق کا کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکلا، اور مذہب کی ابتداء اور نشوونما کے متعلق بہت سے مستند، مگر مختلف فیہ نظریے قائم ہوئے۔ اس سوال کا کہ مذہب کی ابتداء کیوں کر ہوتی ہے، ہم کوئی ایک جواب نہیں دے سکتے، صرف جوابات کی ایک مختصر فہرست دے سکتے ہیں۔

(۱) مذہب انسانی جذبات کا ایک مظہر ہے۔ انسان میں جیسے امید، خوف، محبت وغیرہ کے احساسات ہوتے ہیں، ویسے ہی ایک گمان بھی ہوتا ہے کہ اس مادی دنیا سے بر تر ایک مافوق الفطری عالم ہے جس سے انسان تعلق قائم کر سکتا ہے۔ محبت یا خوف کے ساتھ یہ لازمی نہیں ہے کہ ان کی وجہ معقول ہو، انسان کو مافوق الفطری عالم اور قوتوں کے وجود کا جو گمان ہوتا ہے، اس کا درست ہونا ضروری نہیں، اور یہ بہت ممکن ہے کہ وہ کسی اتفاقی واقعے یا کیفیت سے پیدا ہو کر ایسا ذہن نشین ہو جائے کہ حقیقت معلوم ہونے لگے۔ یہ ''نفسیاتی'' نظریہ ہے، جو لوگ اسے تسلیم کرتے ہیں، ان میں سے بعض کے خیال میں مذہب کی ابتداء اس طرح سے ہوتی ہے کہ انسان قدرتی مناظر کو سمجھنے اور ان کے اسباب دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کا تخیل اسے بتاتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، کسی ''شخص'' کے کرنے سے ہوتا ہے، اور اسے تمام قدرتی مظاہر میں اشخاص کی صورت اور خصوصیت نظر آنے لگتی ہے۔ بعض محقق یہ رائے رکھتے ہیں کہ انسان ابتداء میں اپنے مذہبی تصورات کو ان کیفیتوں سے اخذ کرتے ہیں جو خواب، بے ہوشی یا وجد کی حالت میں ان پر گزرتی ہیں۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بغیر جنبش کیے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گئے ہیں، عزیزوں اور دوستوں سے ملے ہیں اور ان سے باتیں کی ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جسم سے جدا ایک چیز ہے جس کو جان یا روح کہتے ہیں، اور اس طرح روح کی بقا، حیاتِ دوام وغیرہ کے عقیدے قائم ہوتے ہیں اور آباء واجداد اور جاندار چیزوں کی پرستش کی جانے لگتی ہے۔ ایک اور خیال یہ ہے کہ مذہب کی پہلی شکل سحر ہے۔ دنیا میں دو طرح کی قوتیں ہیں، شخصی اور غیر شخصی۔ چوں کہ ہمیں کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر شخصی یا فطری قوتیں قاعدے قانون کی پابند نہیں ہیں، مثلاً جب اچانک کوئی

طوفان آجاتا ہے، کوئی حادثہ ہو جاتا ہے، یا کوئی بات خلاف توقع یا خلاف معمول ہو جاتی ہے، اس لیے انسان کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ لیتا ہے کہ یہ قوتیں دراصل روحیں ہیں جو خوش اور ناراض کی جاسکتی ہیں، اور بعض نامعلوم طریقے ہیں جن سے ان پر قابو پانا ممکن ہے۔ اسی وجہ سے تقریباً ہر وحشی قبیلے میں ایک جادوگر ہوتا ہے جس کی نسبت لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ فطری قوتوں سے جو چاہے کرا سکتا ہے۔ جاندار چیزوں کی پرستش اس کے بعد کی منزل ہے، جب عظیم الشان فطری روحوں کے ساتھ انسان اور جانوروں میں روح کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

نفسیاتی نظریے کا مطالعہ کرتے ہوئے فوراً یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ محققوں نے ایک مظہر کا مشاہدہ کر کے اس کے اسباب بتانے کی کوشش کی ہے، اور بہت بھولے پن سے کام لیا ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قدرت کے جان بخش اور ہیبت ناک مظاہر انسان کے تخیل پر بہت اثر کرتے ہیں، اور اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شروع شروع میں انسان قدرت کے انہیں مظاہر کو پرستش کا مستحق سمجھتا ہے، اور ان کی پرستش کرتا ہے، لیکن اصل چیز جس پر محقق کی نظر ہونا چاہیے، وہ جذبہ ہے جو ایک طرف مظاہر سے اثر لیتا ہے اور دوسری طرف انسان کا ایک خاص رویہ قائم کر دیتا ہے، اور جس کی عدم موجودگی میں نہ مظاہر کے مشاہدے کا کوئی اثر ہوتا، نہ پرستش کا خیال پیدا ہوتا۔

(۲) ۱۷۵۷ء میں ڈیوڈ ہیوم نے ایک رسالہ شائع کیا جس کا عنوان تھا "مذہب کی تاریخ بحیثیت ایک قدرتی مظہر کے"۔ اس میں مذہب پر نفسیات اور تاریخ کی رو سے بحث کی گئی تھی۔ ہیوم کا خیال تھا کہ جماعتوں کا مذہب ان کی ضروریات اور خواہشوں کے مطابق شکل پاتا ہے، وہ افراد اور جماعتوں کو اپنے ماحول سے خوش اور مطمئن رکھتا ہے اور انسانی ارتقاء میں مدد دیتا ہے۔ اسی خیال کو قریب ایک صدی بعد فویرباخ نے زیادہ وضاحت کے ساتھ اور تاریخی دلیلوں سے مسلح کر کے پیش کیا اور موجودہ زمانے میں مذہبیات کے ماہر زیادہ تر اسی نظریے کی طرف مائل معلوم ہوتے ہیں۔

(الف) تقابلی دیومالا اور تقابلی لسانیات — آریہ نسل کے چند قدردان، جو وطن پرست جرمن بھی تھے، آریہ زبانوں کا مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ جیسے آریہ زبانیں — سنسکرت، ژند، یونانی، لاطینی، جرمن، انگریزی وغیرہ — سب ایک اصل سے ہیں، ویسے ہی

ایک مذہب ہے جسے ہم تمام آریہ یا ہندی، گرمانی نسلوں کے مذہبی عقائد اور تصورات کا ماخذ قرار دے سکتے ہیں، لیکن محققوں میں سے ''ایک نے بارش، ایک نے طوفان، ایک نے صبح و شام کی رنگ آمیزیوں میں ہندی-گرمانی دیومالا کا سرچشمہ تلاش کیا ہے۔ ایک ہی دیوتا کو کسی نے زمین، کسی نے ہوا، کسی نے بادل اور کسی نے چاند کا دیوتا بتایا ہے۔ اس طرز تحقیق کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ یہ تاریخ کے بالکل خلاف تھا۔

(ب) تقابلی مذہب یا نسلیات — آج کل جو نظریہ سب سے زیادہ علمی عمومیت رکھتا ہے، وہ اس دعوے پر منحصر ہے کہ ابتداء میں تمام نسلوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت وہی تھی جو موجودہ زمانے کے وحشی قبیلوں کی ہے، اور اس زمانے کی مہذب نسلوں کے ادنیٰ اور جاہل طبقوں میں بہت سی رسمیں اور بہت سے تصورات ملتے ہیں جو وحشت اور جاہلیت کے دور سے اس وقت تک قائم رہے ہیں۔ اس بناء پر ہم فرض کر سکتے ہیں کہ تمام دیوتا شروع میں کسانوں کے دیوتا تھے، جن کا میدانِ عمل نباتیات، کھیتی باڑی اور دیہاتی زندگی کے دوسرے مظاہر تھے۔ اس نظریے کے حامی مذہب کے ساتھ معاشرت کا مطالعہ بھی ضروری سمجھتے ہیں، اور اسی وجہ سے انگلستان میں اجتماعیات کے اس شعبے کو علم الانسان کا نام دیا گیا ہے۔ اِس اصولِ تحقیق پر عمل کرنے سے مذہب کے ساتھ وہ معاشرتی رسمیں اور قانون جن میں مذہبی عقائد ظاہر ہوتے ہیں، نظر کے سامنے آگئے اور یہ معلوم ہوا کہ ''ٹیبو''، سحر، ''ٹوٹم'' اور پرستش کے مخصوص طریقے وحشی قبیلوں کے مذہب کا لُب لباب ہیں۔ ''ٹیبو'' یہ ظاہر کرتا ہے کہ وحشی قبیلوں کو نامعلوم قوتوں کا احساس ہوتا ہے۔ خاص چیزیں، مقامات، اشخاص، جانور وغیرہ اس نامعلوم قوت کے حامل مانے جاتے ہیں۔ ایسے مقامات پر جو ''ٹیبو'' ہوں، جانا منع ہوتا ہے، وہ چیزیں جو ''ٹیبو'' ہوں استعمال نہیں کی جاسکتی ہیں، ان لوگوں کو جو ''ٹیبو'' ہوں، ضرر پہنچانا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے۔ یہ قدیم مذہب کا قریب قریب پہلا مظہر ہے۔ باقی سب شکلیں بعد کی ہیں۔ ٹیبو کے ساتھ سحر کا عقیدہ بھی وابستہ ہے۔ مشہور انگریزی محقق فریزر کے نزدیک سحر کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک وہ جس میں اس شخص کی جس پر سحر کرنا مقصود ہوتا ہو، کوئی ملکیت جیسے بر تن، یا اس کے جسم کا کوئی حصہ جیسے ناخن یا بال پر جادو کیا جاتا ہے، اور دوسرا وہ جس میں کسی شخص تک جادو کا اثر پہنچانے کے لیے اس کی شبیہ بنائی جاتی ہے اور اس پر جادو کیا جاتا ہے۔ لیکن سحر دراصل مذہب سے بالکل جدا چیز ہے، کیوں کہ مذہب

اجتماعی ہوتا ہے اور جماعت کے لیے مفید خیال کیا جاتا ہے، مگر جادو کے اثر میں اعتقاد رکھنا ایک نامعلوم غیر شخصی قوت پر اعتبار کرنا ہے۔ جادو ہر شخص اپنی غرض کے لیے کرتا ہے اور وہ جماعت میں اتحاد کی جگہ انتشار پیدا کرتا ہے۔

ٹیبو اور سحر سے ایک منزل آگے ٹوٹم کا تصور ملتا ہے۔ بہت سے قبیلے کسی جانور کو ٹوٹم، یعنی اپنی خاص علامت بنا لیتے ہیں، اور اس طرح سے اپنے اندر اتحاد اور شخصیت کا احساس قائم رکھتے ہیں۔ جو جانور ٹوٹم قرار دیا گیا ہو، اسے مارنا یا ضرر پہنچانا بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔ محققوں کی رائے ہے کہ ٹوٹم کو یہ عزت اور مرتبہ اسی وجہ سے دیا جاتا ہے کہ وہ قبیلے کا جدامجد سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ خیال کہ دنیا کی ہر نسل ٹوٹم پرستی کے دور سے گزری ہے، اب عام طور سے تسلیم نہیں کیا جاتا، اور یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ٹوٹم کا رواج خاص معاشرت کے ساتھ وابستہ ہے۔

نسلیات اور علم الانسان کے ماہر مذہبی عقائد اور دیومالا کے مقابلے میں پرستش کے طریقوں کو زیادہ غور طلب مانتے ہیں۔ پرستش کے طریقے متعین ہو جانا مذہبی ارتقاء کی تیسری منزل ہے، جب کائنات کی نامعلوم قوتیں مختلف دیوتاؤں کے درمیان تقسیم کر دی جاتی ہیں، کوئی خاص دیوتا قبیلے کا محافظ اور روحانی سردار تصور کیا جاتا ہے اور اس کی پرستش قبیلے کے مذہبی اور معاشرتی ربط و اتحاد کا اور اس کی ترقی کی ضامن بن جاتی ہے۔ ابتداء میں دیوتاؤں کی طرف جو خاص قدرت منسوب کی جاتی ہے وہ انسان اور حیوان کی نسل کو قائم رکھنے، زمین کی پیداوار بڑھانے اور جماعت کو تمام مخالف اور مضر اثرات سے بچانے کی طاقت ہے۔ اس دور میں مذہبی زندگی تہواروں کا ایک سلسلہ ہوتی ہے اور تہواروں کا تعلق فصل اور موسم سے ہوتا ہے۔

(۳) محققوں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو یونانیوں اور ہندی-گرمانی نسلوں کو شائستگی اور علم کا ہراول نہیں مانتا، بلکہ بابل والوں کو تمام دنیا سے پہلے معلم قرار دیتا ہے، کیوں کہ علم النجوم کی ابتداء بابل سے ہوئی، وہیں سب سے پہلے ستارے پہچانے گئے اور دیوتا تصور کیے گئے، لیکن دنیا کی تاریخی پیچیدگیوں کو اس طرح سلجھا دینا، چاہے آسان ہو، مگر صحیح ہرگز نہیں ہے۔ دُنیا میں کہیں اور کبھی ایک مرکز پر علم اور عقل کا اتنا ذخیرہ جمع نہیں ہوا ہے کہ وہ بورڈنگ کے کھانے کی طرح تقسیم کیا جا سکے۔ تمدنی دولت قومیں کچھ اپنی محنت سے حاصل کرتی ہیں، کچھ

انہیں ایک دوسرے سے ورثے میں ملتی ہے، مختلف قوموں کے مذہب اور تمدن کا کوئی ایک ماخذ نہیں ہے۔

مذہب کی ابتداء کی نسبت جتنے نظریے اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان سب میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محققوں نے مذہب کا صرف ظاہری رُخ دیکھا ہے، اور دل کی ان کیفیات تک ان کی رسائی نہیں ہوئی ہے، جو مذہبی تصورات کا سرچشمہ ہیں۔ وجودِ باری کا احساس بطور وارداتِ قلبی اور مذہبیت کی اصل تک ہم ظاہری باتوں کے مشاہدے اور خارجی اثرات کی تفصیل معلوم کرنے سے نہیں پہنچ سکتے، بلکہ اس کے برعکس ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مذہبی آداب ورسوم میں معنی اور مقصد مذہبیت اور وارداتِ قلبی کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں۔ مذہب کے ابتدائی مدارج میں دیوتاؤں کا تصور قائم کرنے کے لیے مادی چیزوں سے استعارے کا کام لیا جاتا ہے، مادی مظاہر کی پرستش نہیں کی جاتی۔ مذہب کسی خارجی تحریک کا نتیجہ نہیں ہے، وہ تاثرات اور احساسات کی جمع یا تفریق کا جواب نہیں ہے۔ جرمنی کے ایک عالم دینیات، ڈاکٹر روڈولف اوٹو نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ''مذہب کا سرچشمہ خود مذہب ہے''، اس کی ابتداء اور انتہاء اس کے اپنے اندر ہے۔